اکیسویں صدی کے مسائل اور اُردو افسانہ

ڈاکٹر صنم شاکر
وفاقی جامعہ اُردو برائے فنون، سائنس وٹیکنالوجی، اسلام آباد
ڈاکٹر محمد وسیم انجم
صدر شعبہ اُردو، وفاقی جامعہ اُردو برائے فنون، سائنس وٹیکنالوجی، اسلام آباد

URDU FICTION
AND TWENTY FIRST CENTURY'S ISSUES

Sanam Shakir, PhD
Fedral Urdu University, Islamabad

Muhammad Waseem Anjum, PhD
Chairman Department of Urdu
Fedral Urdu University, Islamabad

Abstract

Of the 21st century, the most momentous occurring which influenced humanity altogether, was the fateful event of 9/11. The consequences that followed, swayed people's lives from a private to a great social extent. The inevitable corollaries came in the shape of Jihadi foundations, religious extremism, terrorism and target killing. Fear, terror and distrust rooted itself in the society and left behind, no nuance between friend and foe. These are the subjects that are penned by Urdu short story writers.

Keywords:
اُردو، افسانہ، اکیسویں صدی، حمید شاہد، محجبہ عارف، پاکستانی اردو افسانہ

تاریخ اورانسانی ذہن میں گذشتہ اور آئندہ پیوست رہتا ہے۔ ماضی کی بنیاد پر نئے رجحانات جنم لیتے اور ثقافت وتہذیب میں رنگینیاں پیدا ہوتی ہیں۔جسے تاریخی ارتقا بھی کہا جا سکتا ہے۔

دنیا نے بیسویں صدی کے پہلے حصے میں دو عظیم جنگیں دیکھی جو گذشتہ کی کشمکش کا بھی نتیجہ ہیں لیکن اس میں سائنسی ذہن کی کارگزاریاں بھی تھیں۔ایٹمی توانائی کی دریافت نے منفی رجحانات کو جنم دیا۔ چنانچہ پہلا ایٹمی تجربہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر کیا گیا جس کے نتیجے میں لاکھوں افراد متاثر ہوئے۔سائنس اور آگے بڑھی تو انسان چاند تک جا پہنچا۔خلا کی تسخیر پیشِ نظر تھی۔انسانی ذہن مثبت اور منفی رجحانات سے آگے بڑھا۔اشتراکیت کا فلسفہ سیاسی قوت بن کر سامنے آیا۔کبھی برطانوی سلطنت کا ڈھلتا سورج نظروں میں آنے لگا اور کبھی سوویت یونین بکھرنے پر آمادہ ہوئی۔انسان کا ذہن مزید آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ مشینی قوت سے خلا کی تسخیر کی طرف پیش رفت ہوئی۔

اکیسویں صدی کے اوائل میں مسلم ممالک زیروزبر ہونے لگے۔باہمی نفاق نے انھیں مغربی ترقی کا پرستار بنا ڈالا نیز وہ باہمی نفاق میں الجھ کر رہ گئے۔تاریخ کا یہ عمل جاری و ساری رہا۔تاریخ کا دھارا کہیں رکتا نہیں اور نہ ہی انسانی ذہن کہیں ٹھہرتا ہے۔تاریخ کی ان تبدیلیوں نے ذہنِ انسانی کو کہیں حقائق کا شعور دیا اور کہیں منفی رجحانات نے انسانیت کو تہہ وبالا کیا۔ادب میں تبدیلی انھی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہے۔جیسے جیسے ہمارے گردوپیش کی دنیا بدلتی رہتی ہے اسی طرح شعورو ادراک کے پیمانے بھی تبدیلی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔آج کی سائنس نے انسانی زندگی کو ایک طرف آسودہ کیا مگر زندگی کو تجلک بھی بنا ڈالا۔

سائنس کی جدید ایجادات جو بیسویں صدی کے اواخر میں اپنی جگہ بنا چکی تھیں،اکیسویں صدی کے آغاز پر نت نئی تبدیلیوں کے ساتھ رونما ہوئیں۔سامراجی چیرہ دستیوں نے پوری دنیا کو متاثر کیا جس کی بدولت تہذیبی اور معاشی دخل اندازی بڑی قوموں کی استعاری اور استحصالی سوچ نے پوری معاشرتی زندگی پر مثبت اور منفی اثرات مرتب کیے۔اور بعض غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کو سیاسی اور معاشرتی سطح پر مسائل سے دوچار کیا۔یہی وہ موضوعات ہیں جو اکیسویں صدی کے اُردو افسانے میں نظر آتے ہیں۔کہیں اخلاقیات،اقدار اور خیروشر کے تصورات میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور کہیں سائنسی ایجادات نے انسان کی زندگی کا رُخ موڑا۔بدلتی زندگی میں جتنے بھی رخ پیدا ہوئے افسانہ اُن کی عکاسی کرتا رہا۔ان متنوع موضوعات میں اہم واقعہ نائن الیون کا ہے۔اس سے پیدا ہونے والے اثرات اکیسویں صدی کے افسانوں میں جابجا نظر آتے ہیں۔جہادی تنظیمیں،دہشت گردی،مذہبی انتہا پسندی،پاکستان کی سالمیت کو خطرات،مسلم ممالک کی متزلزل سرحدیں،علمائے دین کی کارگزاریاں،بے روزگاری،غربت،جہالت،

موقع پرستی، نسلی تعصب و تصادم یہ وہ موضوعات ہیں جو معاشرتی زندگی کے عکاس اور ترجمان ہیں ۔آج کی دنیا تیزی سے تغیرات کی رو میں آتی جا رہی ہے ۔صنعتی معاشرے کا انسان اپنی پہچان سے دور ہوا۔اس کی پہچان کا کھو جانا اس کی فردیت کا گم ہو جانا ایک ایسا المیہ ہے جس سے انسان میں انسانی اقدار کا زوال نظر آتا ہے۔اسی دور میں افراد و معاشرہ کچھ بے جان سے بھی ہوئے اور زندگی میں وہ حرارت بھی نہ رہی جو اس سے پہلے تھی۔افسانہ نگاروں نے اسی نکتے کو افسانے کی بنیاد بنا کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔انفرادی سطح پر شناخت کا گم ہو جانا تکلیف دہ عمل ہے۔علی حیدر ملک ''بے زمیں، بے آسماں'' افسانے میں اس المیے کو لکھتے ہیں:

> ''میری پہچان نے موت کا ذائقہ چکھ لیا ہے اور اب مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں، میں ہوں۔۔۔۔تو تم سب بھی میری ہی طرح اپنی پہچان کھو چکے ہو اور اب بے نام زندگی گزار رہے ہو۔''(۱)

مشینی زندگی نے پرانی قدروں پر زد ڈالی جس سے نئے سماجی مسائل معاشرتی زندگی میں سامنے کر آئے۔صنعتی ترقی نے وقت کی تیز رفتاری میں ایسا اضافہ کیا کہ خود انسان اپنے پیچھے بھاگنے لگا۔جس نے اس کی پہچان کو دھندلا دیا۔رشید امجد نے معاشرے کے عام آدمی کی بے بسی، بے گانگی، پہچان کی گم شدگی، تنہائی، جبر، عدم تحفظ جیسے مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔''نارسائی کی مٹھیوں میں'' کے زیرِ عنوان افسانے میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

> ''اس کی یادداشت کی چڑیا صدیوں کے گنجلک چہرے پر پھیلی ہوئی پہچان کو بہت دیر سے دانہ دانہ چگ رہی تھی ۔لیکن جب بہت دیر کے بعد بھی بنجر شباہتوں کی گود سے یاد کے ہمکتے بچے نے سر نہ اٹھایا تو اس کے دل میں سرسراتی خوشی مرجھاہٹ کی کھردری مٹھیوں میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔''(۲)

تلاشِ معاش کی خاطر اور اقتصادی ناہمواری سے مجبور ہو کر سرزمین چھوڑ سمندر پار جانے کا سلسلہ ابتدا ہی سے کسی نہ کسی طرح نظر آتا ہے ۔لیکن اکیسویں صدی میں اس رجحان نے بہت تقویت حاصل کی کہ دیہات سے شہروں کی طرف نقل مکانی کا ایک سلسلہ بھی شروع ہوا۔غیر ممالک میں پہنچنے پر انھیں نئے تجربات اور نئے تقاضوں کے تحت اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش نظر آتی ہے۔جس کے نتیجے میں وہ اور تو سب کچھ بنتے رہے لیکن پھر کبھی وہ نہ بن سکے جو وہ اصلاً تھے ۔اپنی پہچان بنانے کے لیے پہچان کھو دینے والا شخص کیسے کیسے انداز اختیار کرتا ہے، افسانوں کے بہت سے موضوعات اس ضمن میں اپنی جگہ بناتے چلے گئے ۔

ہر دور میں معاشرہ مختلف طبقات میں بٹا ہوا نظر آتا ہے اور ان طبقات میں عصری ترقی یا تنزلی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔کوئی دور بھی دانشور طبقے سے خالی نہیں رہا۔کہیں سرمایہ دار طبقہ ہے کہیں مزدور اور کسان دکھائی دیتے ہیں ۔اعلیٰ طبقہ سرمایہ دار کہلاتا ہے درمیانہ طبقہ روایت پسند اور نچلا طبقہ ضروریات زندگی سے محروم لیکن تمام طبقات میں روح عصر اپنی جگہ کام کر رہی ہوتی ہے۔صنعتی ترقی نے انسان کی آسائش میں خوب اضافہ کیا۔اعلیٰ طبقے یا سرمایہ دار میں آسائش زندگی کی پہچان بنی۔جبکہ درمیانے طبقے میں روایات کا بھرم کسی نہ کسی طرح ضرور دکھائی دیتا ہے۔نچلا طبقہ ضروریات زندگی سے محروم کبھی اعلیٰ طبقے کے رحم و کرم اور کبھی اپنی خودی کا بھرم رکھنے میں کوشاں ۔چنانچہ ہر معاشرہ اسی طرح کے روحِ عصر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔اسی حوالے سے احمد داؤد ''وسکی اور پرندے کا گوشت'' افسانے میں لکھتے ہیں:

> ''تم آسمان کے بہت قریب رہتے ہو۔یہ پرندے جنھیں دیکھ کر آزادی کی امنگ اُبھرتی ہے کیا اس آسمان تلے واقعی آزاد ہیں؟ میں نے سہم کر اس کی طرف دیکھا اور کہا تم نے وہ تازہ ریگولیشن نہیں پڑھا جس میں پرندوں کا ذکر اور آسمان کی طرف دیکھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔میں نے اسے اخبار دیا تو وہ اسے مروڑتا ہوا کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔''(۳)

ہم دورِ جدید پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سائنسی ترقی نے کئی منزلیں طے کر لی ہیں، لیکن اس سے طبقاتی فرق نمایاں ہوتا رہا خاص طور پر مشرقی ممالک میں طبقاتی فرق نے اپنے جال خوب پھیلائے ۔مشرق سے وابستہ انسان بے شمار واہموں اور وسوسوں اور بے یقینی و بے اطمینانی میں گھرا ہے۔بظاہر اقتصادی ترقی موجود ہے لیکن اخلاقی گراوٹ کی بھی کمی نہیں ۔خاص طور پر طبقاتی کشمکش نے آدمیت سے بہت کچھ چھین لیا ہے۔جمہوری نظام اور مطلق العنانیت نے بھی ایسے ایسے رنگ دکھائے کہ انسان ان کے چنگل سے نہ نکل پایا۔جمہوریت اور آزادی فکر و عمل سے متعلق افرادِ معاشرہ کی رائے میں توازن نہیں ۔بعض افسانہ نگار مطلق العنانیت کے موذی اثرات سے متعلق افسانے تحریر کرتے ہیں تو کچھ افسانہ نگاروں نے جمہوریت کی ناکامی کو اپنا موضوع بنایا۔ان میں علی حیدر ملک کا افسانہ ''ٹھنڈا سورج'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں منتخب ایوانوں اور عہدیداروں پر گہرا طنز کیا ہے۔وہ جمہوری اداروں کی بجائے جاگیرداری اور سرمایہ داری کے سائے میں پروان چڑھنے والی عوامی نمائندگی کو ہدفِ ملامت بناتے ہیں۔علی حیدر ملک ''ٹھنڈا سورج'' میں لکھتے ہیں:

''ایک آدمی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: کیا کرے گا بھائی! ہم کو تو ہر پارٹی کو خوش رکھنا پڑتا ہے سب کو برابر چندہ دیتا ہے۔تا کہ کوئی بھی پاور میں آئے تو کاروبار کو کوئی نقصان نہ ہو۔''(۴)

عوام کے نمائندے مصلحتوں اور خواہشات کے ہاتھوں بک کر اپنے وعدے بھول جاتے ہیں۔ عوام بھی حق کی بات کہنے سے گریز کرتے اور مصلحت سے کام لیتے ہیں۔اسی رُخ کو منشایاد اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔جن میں'' کاشی'' افسانہ قابلِ ذکر ہے۔

''وہ لوگ کتنے عظیم اور غیر معمولی انسان تھے جو اپنے بیٹوں کو حق کی راہ میں قربان کر دینے کا جذبہ رکھتے تھے۔میں نے خود سے کئی بار سوال کیا ہے کہ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں مگر مجھے بڑے سے بڑے آدرش کے لیے بھی اپنی طرف سے خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ملا۔''(۵)

سیاسی جبریت اور استحصال کا ایک سلسلہ دورِ جدید میں بھی نظر آتا ہے۔پاکستان کے جدید افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر بھی بے پناہ افسانے لکھے ہیں۔آج کے دور میں جبر واستحصال اور آمرانہ رویوں کو شدت سے محسوس کیا جاتا ہے،جس سے افسانہ نگاروں میں بے یقینی اور بے اطمینانی نے اپنی جگہ بنائی ہے۔جبکہ سماجی ناانصافیوں اور فرسودہ روایات نے صدیوں سے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔جس سے شعورو بے شعوری میں کافی حد تک حدِ فاصل نظر آنے لگی اور حقوق واستحصال پر نظر آن ٹھہری جسے ہر معاشرے کا فرد محسوس کرتا ہے۔موجودہ نسل میں بداعتمادی اور بے عقیدگی بھی راسخ ہے چنانچہ یہی وہ موضوعات ہیں جو اکیسویں صدی کے افسانے میں جابجا نظر آتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''آج کا انسان محض کسی ایک ملک کا باشندہ نہیں،عالمی برادری کا ایک رکن ہے اور اسی لیے جو کچھ عالمی سطح پر ہوتا ہے چاہے وہ عالمی تحریکات، واقعات اور حادثات کی صورت میں ہو یا عالمی انکشافات کے پیرائے میں، وہ اس سے اثر ضرور قبول کرتا ہے۔''(۶)

سائنسی ایجادات کے نت نئے تجربات اور آلات نے انسانی زندگی میں جو انقلاب برپا کیا وہ بڑھتا چلا گیا۔تاہم اس سے ماخوذ خطرات کی ان گنت کہانیاں بھی دیکھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔سائنس کی عطا کردہ ہر سہولت کے ساتھ عدم تحفظ نے اپنی جڑیں اتنی مضبوط کیں کہ پرانی نسلوں سے ہوتی ہوئیں نئی نسل میں بھی راسخ ہوتی چلی گئیں۔لیکن ان کے مضر اثرات کو دورِ جدید کا انسان خاطر میں نہ لانے کے باوجود بھی عدم تحفظ کو محسوس کرتا ہے۔جدید افسانہ نگار بھی اسی بدلے ہوئے معاشرے میں سانس لیتا ہے اور ان

کیفیات کو شدت سے محسوس کرتا ہے کہ خطرات اور خدشات کس طرح موجودہ عہد میں ہر قدم پر اس کے دامن میں اُلجھاؤ پیدا کرتے ہیں۔

''تار سے تار ٹکراتی ہے تو شعلہ لپکتا ہے اور گھور اندھیرا ــــــ اگر تار ٹوٹ کر مجھ پر آ گریں؟ وہ جست لگا کر سڑک کے بیچو بیچ آ جاتا ہے ــــــ اُڑتی مٹی سے آنکھوں کو بچاتے، اسے خیال آتا ہے اگر اچانک کوئی تیز رفتار گاڑی آ جائے تو ــــــ''(۷)

اکیسویں صدی میں شہروں کے پھیلاؤ اور بڑھتے فاصلوں کے ساتھ ساتھ لوگوں میں وقت کی کمی کا احساس بھی شدید تر ہوا ہے۔سماجی سرگرمیوں میں تیزی اور مذہبی فرائض سے دور ہونا بھی اکیسویں صدی کا سنگین مسئلہ بن جاتا ہے جبکہ فرقہ بندی نے بھی معاشرے کو تہہ و بالا کیا۔مغربی اثرات کے تحت مشرقی ماحول میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اس حوالے سے رشید امجد کا افسانہ ''سناٹا بولتا ہے''اہمیت کا حامل ہے انھوں نے اپنے افسانے میں اِن عوامل کا ذکر کیا ہے جو بنیادی طور پر مغربی معاشرت کی پیداوار لیکن مشرقی ماحول میں بھی ان کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔(۸)

سائنسی ایجادات کی بدولت سڑکوں پر برق رفتار گاڑیوں کی تعداد میں روز افزوں اضافے کے سبب فاصلے سمٹتے چلے گئے لیکن ساتھ ہی نیا مسئلہ اژدھے کی صورت منہ کھولے نظر آتا ہے اور وہ مسئلہ ہے آئے دن سڑکوں پر پیش آنے والے حادثوں کا، جن کا شکار ہو کر کوئی مختلف اعضا سے محروم ہو جاتا ہے اور کہیں جان گنوا دینے کے حادثات نظر آتے ہیں۔اس صورتِ حال نے فرد کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا ہے اور اب وہ کسی بھی لمحے اپنے کسی عضو سے بچھڑ جانے یا اپنی زندگی سے محروم ہو جانے کا خدشہ دل میں لیے زندگی بسر کر رہا ہے۔فرد کی انھی کیفیات کا اظہار، اے خیام کے افسانے ''برزخ'' میں نظر آتا ہے:

''دن بھر میں دو چار بڑے حادثوں کا ہو جانا کوئی ایسی مشکل بات تو تھی نہیں ــــ یہ روزانہ کا معمول تھا۔چھوٹے موٹے حادثے تو ہوتے ہی رہتے تھے۔ان تمام حادثوں میں جو اس کی نظروں کے سامنے ہوئے وہ خود کو ہر طرح شریک محسوس کرتا۔کبھی اپنی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی محسوس کرتا، کبھی سر پر پٹی بندھی ہوئی اور کبھی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا بھی اس نے خود کو دیکھا تھا۔''(۹)

شہری زندگی میں ایک عجیب اضطرابی کیفیت پائی جاتی ہے کہ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔برسوں پڑوس میں رہنے کے باوجود لوگ ایک دوسرے کو نہ جانتے اور نہ ہی پہچانتے ہیں۔عدم تحفظ کے احساس نے لوگوں کو ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا ہے۔لوگ جان و مال کی حفاظت میں اپنے اندر ہی سمٹ کر رہ

گئے ہیں۔ موجودہ عہد میں انسانی زندگی ارزانی اور بے وقعتی کا شکار ہے۔ اخلاقی قدروں کا زوال، لاقانونیت، سیاسی دھاندلیاں، شکوک وشبہات، واہمے، جبر، بے بسی، بے چینی اور انتشار یہی وہ مسائل ہیں جن کی بدولت معاشرے میں عدم تحفظ کا احساس شدید تر ہوتا گیا۔ جدید اردو افسانے میں اس صورتِ حال کی تصویر کشی کئی افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ مسیح آہوجہ اس حوالے سے اپنے افسانے "برسات کی رات" میں لکھتے ہیں:

"نہ جانے وہاں صبح کس لمحے شروع ہوتی اور کس وقت شام کا شامیانہ تن جاتا۔ اس نے تو اسے ایک ہی رنگ میں دیکھا۔ گھر سے جو بھی قدم اُٹھتا وہ اس کی پُر پیچ بھول بھلیوں میں ہی کھو جاتا۔ اس عظیم شہر کو وہ مشینی درندے کا پیٹ کہتا جہاں وہ پانچ سال سے قید تھا۔"(۱۰)

ہر دور کا ادب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اکیسویں صدی کے اُردو افسانے میں دہشت گردی کے موضوع پر بھی افسانے لکھے گئے۔ بالخصوص کراچی میں ہونے والی دہشت گردی کو موضوع بنایا گیا۔ اکیسویں صدی کے آغاز تک کراچی شہر کی فضاؤں میں خوف و دہشت نے اپنے پنجے گاڑھ رکھے تھے اور روشنیوں کا یہ شہر بدحالی کی داستان بیان کر رہا تھا۔ اپنے ہی ملک میں لوگ ہر وقت حالتِ جنگ میں رہ رہے تھے۔ صنعتی شہر میں دہشت گردی کی وحشت اپنے عروج پر، بھتہ اور اغوا کا کاروبار خوب چمک اُٹھا، پورا معاشرہ عدم تحفظ، خوں ریزی، انتقام اور دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ چکا۔ نسلی اور لسانی نفرتوں نے زندگی کو بدحال کر دیا اس حوالے سے زاہدہ حنا کا افسانہ "بہ ہرسُو رقصِ بسمل بود" مبین مرزا کا افسانہ "خوف کے آسمان تلے" اور منشا یاد کا افسانہ "سارا سفر افسوس کا ہے" قابلِ ذکر ہیں۔

علاقائی تناظر سے نکلیں تو دنیا میں دہشت گردی کا پھیلاؤ نظر آتا ہے جس کی بنیادوں میں وہ جان لیوا ہتھیار ہیں جو دھرتی پر موجود تمام جانداروں کی بربادی کا باعث ہیں۔ ان میں انسان سرِفہرست ہیں۔ سائنسی ایجادات نے موت کے متنوع کھیل کھیلے۔ خاص طور پر ایٹم بم جیسی خوفناک ایجاد کوئی دوسری نہ تھی۔ جس نے پوری دنیا کو غیر محفوظ کر دیا اور نسلِ انسانی کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ نصف صدی میں جوہری توانائی کئی گنا بڑھی اور تابکاری مادے کے مہلک اثرات میں خوفناک اضافہ ہوا۔ جوہری ہتھیاروں سے دنیا کو نیست و نابود کیا جا سکتا ہے۔ دنیا بھر کے ادیبوں اور شعرا نے دوسری جنگِ عظیم کی ہولناک تباہی و بربادی پر نوحے لکھے اور اس عمل کی مذمت میں جتنا کچھ لکھا گیا شاید ہی کسی اور موضوع پر لکھا گیا ہو۔

بیسویں صدی کے ہولناک واقعات کے تناظر میں اگر اکیسویں صدی کو دیکھا جائے تو اس صدی کی ابتدا ہی میں ۱۱ ستمبر کا واقعہ ہوا جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ بظاہر یہ واقعہ امریکہ میں رونما

ہوا لیکن اس کے اثرات پھیل کر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں ۔ پاکستانی ادب پر اس کے اثرات بہت نمایاں ہوئے ۔ بالخصوص اُردو افسانہ نگار اسی موضوع کی عکاسی مختلف انداز میں کرتے ہیں ۔ نیلوفر اقبال کا افسانہ ''اوپریشن مائس'' انھی حالات کا عکاس ہے جس میں امریکی انتقام کو واضح کیا گیا ہے۔ جس کا مرکزی کردار اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود پینٹا گون کی مصلحتوں کو نہ سمجھ پایا۔ امریکی سیاست کی منطق سے بے خبر رہتا ہے اور اس کی پالیسیوں کے خلاف مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ اس افسانے کے سبھی کردار الجھنوں کا شکار ہیں ۔ افسانہ نگار اپنے کرداروں کے نام اور اُن کے مکالموں کے ذریعے حالات کو طنزیہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ افسانے میں امریکہ کے متضاد رویوں کی عکاسی کی گئی ہے ۔ خود پسندی اور پالتو جانوروں سے محبت لیکن انسانیت سے نفرت نا انصافی امریکی پالیسی کا مرکزی رویہ رہا ہے ۔

نائن الیون کے واقعہ نے اُن کی پالیسی کو واضح کر دیا ۔ بالخصوص مسلم ممالک سے متعلق امریکہ کا نقطہ نظر بہت ہی واضح ہو گیا ہے ۔ بظاہر جمہوری لیکن اصل میں سرمایہ دارانہ نظام پر عمل چھوٹے ملکوں خاص طور پر مسلم ممالک کو تہہ و بالا کرنا اُن کا مقصدِ اولیٰ ٹھہرا۔ نائن الیون کے اثرات حمید شاہد کے افسانہ ''سورگ میں سور'' میں بھی واضح ہے ۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو تیسری دنیا کے ممالک میں پیش قدمی کا موقعہ ملا ۔ چنانچہ وہ پسماندہ ممالک کو ورغلانے اور کچلنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہوئے ۔ اس کے اثرات سے متعلق حمید شاہد لکھتے ہیں:

> ''یہ کتے ہمارے کھیت اُجاڑنے والوں کے عادی ہو گئے ہیں ۔۔۔عادی، خوفزدہ یا پھر ان ہی جیسے ۔''(۱۱)

گیارہ ستمبر کے پسِ منظر میں لکھے جانے والے اس افسانے میں سوروں کی آمد، کتوں کی بہتات اور بکریوں کی اموات جیسی علامتوں سے مصنف نے عالمی استعمار کی مکروہ سازشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ نائن الیون کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال کے حوالے سے حمید شاہد کا ایک اور افسانہ ''گانٹھ'' بھی اہمیت کا حامل ہے ۔

شر انگیزی، ٹارگٹ کلنگ جیسی اصطلاحیں نائن الیون ہی کی دین ہیں، جو صرف تیسری دنیا تک محدود نہیں رہیں بلکہ ترقی یافتہ ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں ۔ جس سے عوام میں خوف وہراس اور بداعتمادی کی جڑیں دور تک پھیلتی چلی گئیں ۔ عرفان احمد عرفی کا افسانہ 'ریلیٹی شو' میں مصنف نے بظاہر ایک ریلیٹی شو کو پیش کیا ہے لیکن درحقیقت وہ اس کے پسِ پردہ اہم حقائق کو دکھانا چاہتا ہے۔ اس کا موضوع دنیا میں پھیلے وہ شر انگیز عناصر ہیں جنھوں نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے ۔

> ''دھماکا بہت زوردار تھا۔۔۔مجھے تو یقین ہو گیا تھا استاد کہ بس اب گئے ۔''(۱۲)

اکیسویں صدی میں عالمِ انسانیت کو درپیش مسائل میں ایک اہم مسئلہ مذہبی جنونیت کا بھی ہے یہ صرف پاکستانی معاشرے ہی کی بات نہیں بلکہ تمام مسلم ممالک کا یہی چلن ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں کے سیاسی واقعات اور پالیسیوں نے اسلام کے مختلف مسالک میں جبری تبلیغ کے رجحان کو بڑھایا ہے۔ جس کی بنا پر پوری دنیا میں اسلام کو ایک تشدد پسند اور جبراً نافذ کیے جانے والے مذہب کے طور پر پیش کرنے میں خوفناک اضافہ ہوا۔ نوجوانوں میں مذہبی جنونیت کو رائج کرنے کا کام جہادی تنظیموں نے کیا اور یہ تنظیمیں کافی حد تک امریکہ کی پشت پناہی کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ مسلم معاشرے میں فرقہ بندی شروع ہی سے نظر آتی ہے لیکن امریکہ کی پالیسی کے نتیجے میں اس میں خوفناک اضافہ ہوا۔ زندگی کی بے ثباتی کا درس دے کر معاشرے میں شہادت کا فلسفہ عام کیا گیا جو ذہنوں کو متزلزل کرنے کا باعث بنا۔

حمید شاہد کا افسانہ "مرگ زار" اسی پسِ منظر میں لکھا گیا جس میں مذہبی عقیدوں اور افراد کی عقیدت مندی کے استحصال کو دکھایا گیا ہے کہ فلسفہ شہادت کو جو عجیب وغریب معنی پہنائے گئے ہیں یہ ایک بڑا انسانی المیہ ہے۔

"آپ کو مبارک ہو آپ کا اور ہمارا معصب شہید ہو گیا۔

لاش کہاں ------

شہید کی وصیت تھی اُسے جلال آباد کے شہدا کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا جائے۔

وقت کم ہے اندھیرا بڑھنے سے پہلے ہمیں پہنچنا ہے۔" (۱۳)

جہادی تنظیموں کی کارروائیوں، طرزِ فکر اور متوسط طبقے کے ذہنی رجحانات اور اقتصادی استحصال پر منشا یاد کی کہانی "ایک سائیکو سٹائل وصیت نامہ" جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ افلاس اور غربت کس طرح نچلے طبقے کے عام سے لڑکے کی کایا پلٹ کر، اُسے انتہا پسند مجاہد میں بدل دیتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجاہد بن کر شہادت کے مرتبے پر فائز ہونا چاہتا ہے لیکن جینے کی آرزو اس کے وصیت نامے کے مضمون میں سسکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے جذبہ جہاد اور شوق کا الزام صرف مولوی کو نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ کردار اُن حالات کی پیداوار ہے جس نے معاشرتی زندگی کو تہہ وبالا کر دیا ہے۔

امریکہ کی توسیع پسندی، محکوم علاقوں پر جدید اسلحے کی نمائش اور اپنی طاقت کا لوہا منوانے کا شوق جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے، خاص طور پر جہادی تنظیموں میں خوب جان ڈالی اور مخصوص عزائم کے لیے انھیں تیار کیا۔ یہی وہ موضوعات ہیں جو اکیسویں صدی کے افسانوں میں نمایاں ہیں۔ سرحدوں کا غیر محفوظ ہونا بھی اسی پسِ منظر میں سامنے آیا۔

اُردو افسانہ نگاروں نے عصری سیاسی واقعات کو اُردو ادب کا موضوع بنایا جو انسان کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں ۔جس میں دہشت اور خوف کے ساتھ بے یقینی اور عدم تحفظ کی فضا نمایاں ہے ۔ ہر طرف معاشی ،عسکری اور سیاسی منصوبہ بندی نظر آتی ہے ۔ بد اعتمادی کی اس فضا نے عوام میں اپنی ہی حکومتوں کے خلاف پروپیگنڈہ سے اسے متزلزل کیا جس سے معاشرے میں بے بسی اور بے چارگی کی صورتحال پیدا ہوئی ۔اکیسویں صدی کے یہی عوامل ہیں جو اُردو افسانے کا موضوع بنے اور اُردو افسانے کا احاطہ کیے ہوئے ہیں ۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) علی حیدر ملک،بے زمیں ،بے آسماں،منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۶ء،ص ۱۱۴

(۲) رشید امجد، ریت پر گرفت، امانت ندیم،کشمیری بازار، راولپنڈی، ۱۹۷۸ء،ص ۱۰

(۳) اعجاز راہی، (مرتب)، گواہی ،عوامی دارالاشاعت، کراچی، س ن،ص ۱۸

(۴) علی حیدر ملک، بے زمیں بے آسماں،منظر پبلی کیشنز،کراچی، ۱۹۸۶ء،ص ۸۷

(۵) منشایاد، خلا اندر خلا،نیشنل بک فاؤنڈیشن ،اسلام آباد، ۲۰۱۰ء،ص ۴۹

(۶) صبا اکرام، جدید افسانہ... چند صورتیں ،زین پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۱ء،ص ۲۷

(۷) رشید امجد، سہ پہر کی خزاں، دستاویز پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۸۰ء،ص ۶۹

(۸) احمد اعجاز، (مرتب)، کہانی کی کہانی ،مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء،ص ۹۲

(۹) اے خیام، کپل وستو کا شہزادہ،منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۳ء،ص ۵۴

(۱۰) رشید امجد ڈاکٹر، (مرتب)، پاکستانی ادب (۱۹۴۷ـ ۲۰۰۸)انتخاب افسانہ اُردو ،اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء،ص ۴۰۲

(۱۱) توصیف تبسم ڈاکٹر، (مرتب)، محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے ،پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء،ص ۴۵

(۱۲) مجیبہ عارف، " ۹/۱۱ اور پاکستانی اردو افسانہ" پورب اکادمی ، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء،ص ۱۵۹

(۱۳) توصیف تبسم ڈاکٹر، (مرتب)، محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے ،پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء،ص ۳۰

✿✿✿